صفحات 290
قیمت 100 روپے
سچی کہانیاں، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
اکتوبر 2019
بانی
معراج رسول
ذوقِ سخن: بہادر شاہ ظفر کے استاد کا زندگی نامہ
نفیس صاحب: ایک باکمال فنکار کا تذکرۂ خاص
عقیدت: اس نے اپنا پنجہ کاٹ کر مولوی صاحب کو پیش کر دیا

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے [illegible]

شاعرِ مدو جزر

شاہ جہاں آباد (دہلی) سے شمال کی طرف 53 میل کے فاصلے پر ایک بستی ہے، نہایت قدیم بستی جسے پانی پت کہا جاتا ہے وہیں 1253
بمطابق 1837 میں وہ پیدا ہوا۔ اس بستی میں تقریباً سات سو سال سے قوم انصار کی ایک شاخ رہتی آرہی تھی۔ ساتویں صدی ہجری میں جب غیاث
الدین بلبن تخت دہلی پر متمکن تھا، شیخ الاسلام خواجہ محمد عبداللہ انصاری (پیر ہرات) کی اولاد میں سے ایک خواجہ ملک علی، ہرات سے ہند آئے اور
یہاں فروکش ہوئے۔ ان کا سلسلہ 26 واسطہ سے حضرت ابوایوب انصاریؓ سے جا کر ملتا تھا۔ انہیں سلطان نے ایک بڑی جاگیر بطور اعزاز بخشی تھی۔
یہ بچہ اسی نسل سے تھا۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بھی اس خاندان میں سات سو سال سے کسی نے کبھی ملازمت نہیں کی۔ بادشاہان کی بخشی ہوئی جاگیر
پر سب کا گزارہ تھا مگر اس بچے کے والد نے وقت رہتے اندازہ لگالیا تھا کہ اب بادشاہان کا دور گزر چکا ہے۔ انگریز صرف محنت کا بدل، وہ بھی حقیر سا
دیتے ہیں۔ پرگنہ پر پرگنہ بکتا جارہا ہے۔ جاگیر کے خاتمے کے بعد آنے والی نسل کا کیا ہوگا؟ اسی خیال نے انہیں انگریز سرکار میں سررشتہ کی ملازمت
پر آمادہ کیا لیکن یہ ملازمت زیادہ عرصہ چل نہ سکی کیونکہ بچے کی ولادت پر ان کی بیگم کا دماغی توازن بگڑ گیا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگیں اس لیے
بچے کی خاطر سادات گھرانے کی انا کا انتظام ہوا۔ انا کی گودوں میں کھیلتے ہوئے بچے نے عمر کی منزلیں طے کرنا شروع کیں لیکن ابھی وہ صرف 9
سال کا ہوا تھا کہ ایک بڑی افتاد آپڑی۔ باپ کا سایہ سر سے چھن گیا۔ بھائی بہنوں نے بچے کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی۔ بھائیوں نے
قرآن حفظ کرایا۔ باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کرکے میر ممنون دہلوی کے بھتیجے سید جعفر علی جو میر ممنون کی بیٹی سے شادی کرکے پانی پت میں ہی رہ رہے
تھے۔ وہ فارسی کا خوب علم رکھتے، فارسی ادب پر دسترس حاصل تھا۔ علم طب میں بھی بدطولیٰ رکھتے تھے۔ ان سے فارسی پڑھی، پھر عربی پڑھنے کا شوق
ہوا تو مولوی حاجی ابراہیم حسین کے مدرسے کا رخ کیا۔ ان سے صرف ونحو پڑھی۔ اب وہ سترہ سال کے ہوچکے تھے۔ بھائی بہنوں نے شادی پر زور
دیا۔ سسرال آسودہ حال تھا مگر تعلیم حاصل کرنے کا شوق سوا تھا اس لیے وہ گھر والوں سے چھپ چھپا کر دہلی آگئے اور مولوی نوازش علی جو اس وقت
کے معروف وعظ تھے ان سے صرف ونحو اور منطق پڑھی۔ ڈیڑھ برس کا عرصہ گزار کر گھر والوں کی ضد اور زبردستی پر واپس پانی پت جانا پڑا۔ یہ ذکر
1855 کا ہے۔ پانی پت لوٹ کر بے پڑھی کتابوں کو پڑھ کر وقت گزار رہے تھے کہ 1856 میں ضلع حصار کے کلکٹر کے دفتر میں قلیل تنخواہ کی نوکری
پر لگ گئے تاکہ کچھ تو آمدنی آئے۔ ابھی ایک سال بھی نہ گزرا تھا کہ غدر شروع ہوگیا۔ سپاہیوں کی بغاوت نے پورے ہند میں زلزلہ سا پیدا کردیا تھا۔
یہ بھی حصار سے واپس پانی پت آگئے اور عرصہ چار سال بیکاری میں گزارے۔ اس عرصے میں وہ بے قاعدگی میں پانی پت کے علماء وفضلا سے
اکتساب کرتے رہے۔ مولوی عبدالرحمٰن، مولوی محب اللہ، مولوی قلندر علی سے منطق، فلسفہ، علم حدیث وتفسیر پڑھتے رہے۔ جب بھی دلی جاتے
تو مرزا غالب سے ملاقات ضرور کرتے۔ سیر حاصل گفتگو ہوتی۔ ایک دوار دو فارسی میں کہی غزلیں انہیں دکھائی تو وہ بولے۔ ''اگرچہ میں کسی کو فکر شعر
کی صلاح نہیں دیتا لیکن تمہاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہوگے تو اپنی طبیعت پر ظلم کروگے۔'' یہ مشورہ گرہ میں باندھ لیا مگر شاعری کو زیادہ
وقت نہ دے پارہے تھے۔ بے روزگاری ستارہی تھی کہ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے در دولت پر حاضری دی اور ان کی مصاحبت میں سات آٹھ سال
گزار دیے۔ نواب شیفتہ کے انتقال کے بعد پنجاب گورنمنٹ بکڈپو میں ملازمت ملی تو لاہور چلے آئے اور انگریزی سے جو کتابیں ترجمہ ہوتیں ان
کی تصحیح کرتے۔ اسی زمانے میں کرنل ہالرائڈ، ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب کی ایماء پر محمد حسین آزاد نے ایک نئی طرح کے مشاعرے کی بنیاد
ڈالی۔ یعنی مصرع طرح کی بجائے کسی مضمون کا عنوان شاعر کو دیا جاتا جس پر وہ نظم کہتا۔ انہوں نے بھی چار مثنویاں، برسات، امید، انصاف اور حب
وطن کہی۔ اسی دوران انہیں دہلی میں اینگلو عربک اسکول میں مدرسی مل گئی تو وہ دہلی آگئے، یہیں انہیں سرسید نے تحریک دی تو انہوں نے مسلمانوں کی
موجودہ پستی وتنزلی پر طویل نظم کہی جو دیکھتے ہی دیکھتے مقبول عام ہوکر پورے ہند میں پھیل گئی۔ عورتوں کو تعلیم دی جائے اس سبجیکٹ پر ''مجالس النسا
''تصنیف کی، سعد شیرازی کی حالات زندگی ''حیات سعدی'' لکھی، ''مقدمہ شعروشاعری'' لکھ کر اپنے دیوان کے ساتھ شامل کیا۔ ''یادگار غالب''
کے عنوان سے مرزا غالب کی حالاتِ زندگی لکھی جو ان کے انتخاب کلام کے ساتھ شامل ہوا۔ 1305 ہجری میں جب وہ اینگلو عربک اسکول دہلی میں
ہی مدرس تھے کہ علی گڑھ جانا ہوا۔ وہاں سر آسمان جاہ، مدار المہام سرکار عالی نظام دکن، سرسید سے ملنے علی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے پہلی ہی
ملاقات میں 75 روپے ماہوار کا وظیفہ مقرر کردیا تاکہ بے فکری سے تصنیف وتالیف کرسکیں جو بعد میں سو روپے ہوگیا۔ عمر کا ایک بڑا حصہ گزر چکا تھا۔
قومی جواب دینے لگے تھے کہ وہ اینگلو عربک اسکول دہلی کو چھوڑ کر پانی پت آگئے اور یہیں 30 ستمبر 1914ء کو 77 سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان
کے بارے میں سرسید احمد خان کہا کرتے تھے کہ جب روز حشر مجھ سے سوال ہوگا کہ اپنی بخشش کے لیے کیا سامان کر آئے تو میں جواب دوں گا کہ حالی
سے مسدس لکھا آیا ہوں۔ ''مدوجزر اسلام'' نامی طویل نظم کہنے والے الطاف حسین حالی کو اردو ادب کبھی بھلا نہیں پائے گا۔ ☆☆☆

سرگزشت

☆ عبدالجبار رومی انصاری کا پیام کراچی سے۔ ”میں پاکستان سے محبت کرتا ہوں تو پاکستان کو کیسے نقصان پہنچا سکتا ہوں، رام دیال کو گولی لگی لیکن ساتھ ہی بھاگتے کالی چرن کو بھی اینٹ سے مار گرایا، مذہب کوئی بھی ہو وطن کی محبت سبھی کو سرشار رکھتی ہے۔ ”دستک“ بہت عمدہ سچ بیانی تھی اچھی لگی۔ گھر پیارے گھر کی حسرت لیے ابراہیم بھی قبر میں جا سویا مگر وہاں سے بھی سڑک بنانے والوں نے قبر منتقل کردی اور افشاں آنکھوں میں آنسو لیے بدنصیبی کا رونا روتی کتبہ ہاتھوں میں لیے گم صم کہ اس کو کس قبر پر لگائے۔ دکھی کر دینے والی کہانی، جس کے کردار ہمیں اپنے آس پاس بکثرت نظر آئیں گے مگر ان کی دادرسی کرنے والا کوئی نہیں۔ اذان کی آواز آرہی ہے تو سمجھو آپ کی منزل آگئی ورنہ روشن اور اس کے ابو کی طرح ادھورے علم کی بنیاد پر تجربے ہی کرتے رہیں گے۔ زندگی کتنی ہے کسی کو پتا نہیں تو پھر مذہب پر تجربہ کیسا؟ چلو یہ بات بھی سائیڈ پر رکھو صرف اس پر غور کرو کہ اذان کی آواز آپ کی منزل ہے اس سے غافل ہوئے تو بھٹک جاؤ گے۔ ”وقفہ“ سمجھداروں کے لیے عمدہ سچ بیانی تھی۔ یہ زمین رقص میں ہے سارا جہاں رقص میں ہے، چاند کو دیکھتے اکا تھا نے رقص شروع کیا تھا اور پھر پورا قصبہ رقص کرتے کرتے موت کے منہ میں چلا گیا۔ عجیب و غریب کہانی تھی جس میں لوگ بے خود ہو کر ناچتے، یہ رقص بھی دنیا کے عجائبات میں سے تھا۔ (اس عجیب واقعہ پر کئی فلمیں بنیں، کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن راز کھل نہ سکا کہ یہ ایسا کیوں ہوتا تھا) میری مالونی نے شوہر کی جان لے لی مگر آسانی سے ہتھیار بھی نہ چھپا سکی اور سراغ رسانوں کے سامنے ہی کھانے کے لیے بھیڑ کی ران رکھ دی۔ شررشر سے چائے نہ نکلیں تو حلق سے نیچے ہی نہیں اترتی اور عدیم بھائی کو جنگل میں منگل بناتی کوئی خوب صورت لڑکی غزالہ اور کنول کے روپ میں نہ دکھے تو حسین یادیں تازہ ہی نہیں ہوتیں اور ایسے حسین پلوں میں شاعری نہ ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہیں کھائی میں اترتا سانپ کہیں پراسرار نظارے دیکھے، تنہیا گلی میں چلتے یادوں کے روپ بہت ہی پیارے دکھے، درختوں کی پرائیویسی کی تو بات ہی اور ہے، کہیں تنوں پہ بنے دل تو کہیں محبتوں کے نام نیارے دیکھے، ”سفر پہلا پہلا“ زبردست جاری ہے۔ ”داستانِ اخبار“ میں اخبار نے تاریخ میں کیسے کیسے مراحل طے کیے، دلچسپ تحریر بے حد اچھی لگی۔ لیمپ والی فلورنس کی جدوجہد نے اسے نامور بنا دیا، اس کا کام عظیم تھا اسے یاد بھی رکھا گیا اور اس کے خدمت انسانی کو بھی سراہا گیا۔ مارٹن کی پراسرار گمشدگی سب کے لیے خوف کا باعث تھی جسے آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی۔ ایسی پراسراریت مغربی ممالک میں عام سی بات ہے۔ صاحب علم عبدالسلام ندوی پر تحریر زبردست تھی۔ شاعری کی اور بغیر استاد کے لوہا منوایا تصنیفی زندگی میں بھی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ سدا بہار فنکار حبیب شوٹنگ دیکھنے آئے اور فنکار بن گئے، فلموں کے ہر کردار میں فٹ ہوئے اور کامیاب رہے۔ بے نظیر بھٹو کے کہنے پر فلمیں بنائیں مگر انہیں ان کا خطیر معاوضہ نہ ملنا افسوس ناک بات ہے۔ ”ناسور“ کے سچ جھوٹ کی آنکھ مچولی بھی جاری ہے۔ فوزیہ کا ساتھ میسر ہوا تو لیلیٰ صماد کی بازیابی کی فکر ہوئی جہاں رسن بستہ سارا اپنے بیٹے کو یاد کرتی ملی وہیں کراس بو گروپ کی دہشت بھی نعمان کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ ہماری پہچان پاکستان کے جانباز نظیر لطیف کی مختصر سرگزشت زبردست رہی جو دشمن پر پلٹنا جھپٹنا خوب جانتے تھے۔ پاکستان کا فخر ایسی ہستیاں اپنے کارناموں کی بدولت وطن کا سر بلند رکھے ہوئے ہیں۔ ”شہر خیال“ میں منشی عزیز مئے کا اٹھارہ سالہ تجزیہ زبردست رہا بہت بہت مبارک ہو۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی کا بھرپور اور عمدہ تبصرہ بہت اچھا لگا۔ رانا محمد شاہد نے بھی خوب تبصرہ کیا ان کی تجویز اچھی لگی میں تو کہوں گا پہلے کی طرح بیت بازی کا سلسلہ دوبارہ شروع کیا جائے۔ عبدالحکیم ثمر، سید امتیاز حسین بخاری، عطاء اللہ شاہ، صبح آفتاب اشرفی، مراد علی، انور اعجاز خان، امتیاز لاکھانی کے بھرپور تبصرے زبردست رہے۔“

☆ عطاء سید کا مکتوب خاص میانوالی سے۔ ”مجھے ماہ ستمبر کا شمارہ تیس اگست کو مل گیا۔ حسب عادت وقفے وقفے سے روزانہ پڑھ رہا

ذوقِ سخن

ڈاکٹر ساجد امجد

دل فگاراں، غم یاد یاراں اور پھر بارش سنگی الفاظ، یورشِ اغیار، دل وحشت زدہ، لذتِ کش آزار مگر وہ کیا کرتا؟ اس کا مزاج ہی کچھ اور طرح کا، وجہ یہی کہ وہ درویشانہ اسبابِ ہنر کے ساتھ، ایام زندگی کو گھسیٹنے پر مجبور تھا۔ کیونکہ چہار جانب طرفہ تماشا تھا کہ شہر ہی کے لوگ، جب کوئی مصلوب ہوتا تو خوش ہوتے، خوں بہا مانگتے خون بہانے والے اور خود جو قاتل تھے وہی داد رسی کرتے۔ ایسے عالم میں بھی وہ خدمت شعر و ادب کرتا۔ مجبور و لاچار شہنشاہ کی دل جوئی کے لیے ہی غزل گوئی کرتا۔

اردو ادب میں نمایاں مقام رکھنے والے کا زندگی نامہ

سلطنت مغلیہ اپنے آخری سفر کی طرف رواں دواں تھی۔ عظیم شہنشاہیت اپنی دیرینہ عظمت کا ایک سایہ ہوکر رہ گئی تھی۔ بلند دیواریں کوتاہ قدی میں تبدیل ہورہی تھیں۔ انگریزوں کی سازشیں اپنا دائرہ مکمل کر رہی تھیں۔ وہ کچھ ہورہا تھا جو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس تباہی میں غیر کیا اپنے بھی شریک تھے۔ غلام قادر روہیلہ نے قلعے پر قبضہ کرکے قیامت برپا کردی۔ شاہ عالم بادشاہ کو معزول کردیا۔ شاہی جواہرات کے حصول کے لیے محلات کے فرش تک اکھاڑ ڈالے۔ بوڑھے شہنشاہ کی آنکھیں نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

ایسٹ انڈیا کمپنی مکار لومڑی کی طرح اشک سوئی کے بہانے آگے بڑھی اور اسے اپنی حفاظت میں لے لیا۔ ایک لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہوگیا مگر موت نے زندگی چھین لی۔

گرتی ہوئی دیوار کے سائے میں اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوئے تو انہوں نے کچھ دن کے لیے ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ انہوں نے ان تمام مراعات اور سیاسی حقوق سے فائدہ اٹھانا چاہا جو انگریزوں اور شاہ عالم کے درمیان معاہدے کی رو سے مغل شہنشاہ کو دیے گئے تھے۔ ایک جانب تو نذر پیش کش میں اضافے کے لیے سرکار کمپنی بہادر سے تقاضا کیا تو دوسری جانب اپنے شاہی اختیارات کے استعمال کے طور پر اپنے فرزند اکبر شہزادہ ابو ظفر کی جگہ اپنے مجھلے بیٹے شہزادہ مرزا جہانگیر کو ولی عہد نامزد کرنے کی سفارش کی۔

یہ دونوں سفارشات مسترد ہوگئیں۔ اس کے برخلاف ہوا یہ کہ شاہی خاندان کی توقیر میں مزید کمی ہونے لگی۔ شاہی عمال کو برطرف کردیا اور سزائے موت پر بادشاہ کی منظوری کی رسم موقوف کردی گئی۔

سیاسی تنگ دامانی کے باوجود قلعے کی زندگی وسیع المشربی کی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ مجرے وسلام، نذر و پیش کش، خطاب و خلعت، انعام و اکرام، رسوم دربار اب بھی ادا ہوتی تھیں۔ قلعے کی دیواروں کے پیچھے دل اداس تھے مگر تفریحات کا بازار گرم رہتا تھا۔ کبوتر بازی، مرغ بازی، بٹیر بازی کا وہی عالم تھا جو اچھے دنوں میں ہوا کرتا تھا۔

دلی والے اب بھی ہر خطرے سے بے نیاز دن گزار رہے تھے۔ جامع مسجد کے نیچے تیسرے پہر کو "گزری" لگتی تھی۔ صد ہا قسم کا کپڑا اور انواع طرح کا اسباب فروخت ہوتا تھا۔

جمنا کے پل کی سیر میں سب سے دلچسپ پیرا کی

نفیس صاحب

آصف مالک

وہ اتنا سادہ مزاج تھا کہ جب لوگ اس کی سادہ مزاجی کا تذکرہ کرتے تو وہ سوچنے لگتا، یہ مری مداح ہے یا کردار کشی؟ اس نے کراچی کو فن و ثقافت کی دولت سے مالا مال کرنے کے لیے زندگی وقف کردی تھی۔ وہ بلاشبہ پاکستان کی نمایاں ہستیوں میں سے ایک تھا۔ آرٹ اینڈ کلچر کی جان کہلاتا تھا۔

اپنے دور کی ایک قدآور شخصیت کا تذکرۂ خاص

آرٹس کونسل کی تھیٹر ورکشاپ میں کلاس لینے کے بعد ہم سب پی اے سی سی میں تھیٹر دیکھنے کے لیے نفیس صاحب کی کار میں جارہے تھے۔ نفیس صاحب ڈرائیو کررہے تھے، فصیح باری خان ان کے برابر میں بیٹھا تھا، جبکہ پچھلی نشست پر میں، حسن عسکری بھائی اور آصف اعجاز براجمان تھے۔ نفیس صاحب کے پاس سبز رنگ کی پرانی نسان نجانے کب سے تھی۔ دیکھنے میں تو لگتا تھا، بس چار قدم ہی چل پائے گی مگر دادو دینی پڑے

دلوں کا بادشاہ

فرزانہ نکہت

بادشاہان ظلم و جبر کی تلوار چلا کر عوام الناس پر حکومت کرتے ہیں مگر اس نے دلوں کو فتح کرنے کا نسخہ آزمایا، اسی کا فیض تھا کہ ایک دوسرے کے خون سے پیاس بجھانے والے بھی اس کی موت پر گریہ کناں نظر آئے۔

حسنِ سلوک سے حکمرانی کو طول دینے والے کا ذکر

شاہ بوڈوئن کی موت کی خبر اہلِ بلجیم پر بجلی بن کر گری! مبصرین کے خیال میں فلیمنگو اور ویلون قبائل کو جو زبان، ثقافت اور نظریات میں ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے، باہم مربوط و متحد کرنے والی چیز ان کی بادشاہ سے محبت تھی۔ اب کیا ہونا تھا؟ کیا قوم پھر کئی حصوں میں تقسیم ہو جانی تھی؟

یکم اگست 1993ء کی اس صبح برسلز کے شاہی محل کے باہر پھولوں کے ڈھیر لگ گئے۔ لوگ روتے اور ایک

ندیم اقبال

احساسات، جذبات، فہم و فراست، حکمت و تدبر اور مشاہدے کو الفاظ کا پیرہن دینا۔ اندازِ بیان کے مختلف قرینوں، سلیقوں سے ناسٹلجیائی کیفیات اور عصری صورتِ حال کو اپنی اظہاری صلاحیت کے ذریعے قارئین کی نذر کرنا، اس طرح پیش کرنا کہ پہلی سطر سے آخری سطر تک قاری اسیر رہے۔ یہ کمال ہے ندیم اقبال کا۔ ''نانگا پربت کا عقاب'' اور ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے بعد ان کا یہ تیسرا سفر نامہ جو جوانی کے ابتدائی ایام کا احوال ہے اور ایک نئے انداز سے لکھا گیا ہے، قارئین کو پسند آئے گا۔

ایک نوجوان کے احساسات و جذبات میں گندھی سفر کہانی

ٹین کی چھتیں بج رہی تھیں۔ عجیب سا شور برپا تھا۔ کبھی لگتا اولے پڑ رہے ہیں۔ کبھی لگتا کوئی پتھر برسا رہا ہے۔ شور بڑھتا گیا اور ہم رضائیوں سے سر نکالے ایک دوسرے کو خوف زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر کوئی میرے عین اوپر چھت پر اتنی زور سے کودا کہ مجھ سمیت سب چونک گئے، پھر یوں لگا جیسے بھگدڑ مچ گئی ہو، لوگ ایک چھت سے دوسری چھت پر کود کود کر بھاگ رہے ہوں۔ اس افتاد پر ہر ایک خوفزدہ ہو گیا

امراؤ جان

منظر امام

سجی ہوئی ہر ایک لب پہ ہے کہانیاں بہت مگر انہیں زبان دینا آسان نہیں، اردو ادب میں سرمایہ تسلیم کیا جانے والا ناول جسے ناقدین نے سہل انداز میں بیان کردہ پہلا ناول تسلیم کیا ہے۔ اسے پردئہ سیمیں پہ کس طرح پیش کیا گیا یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان دونوں ملک میں فلمایا گیا لیکن فرق واضح ہے۔

ناول بنی فلم،اس زاویہ سے تحریر کردہ مختصر سا تذکرہ

مظفرعلی بہت گہری سوچ میں تھا۔

اسے کچھ اور کرنا تھا۔ وہ ایک ذہین انسان تھا۔ اس میں تخلیقی صلاحیت بہت زیادہ تھی۔ اس نے جو کام بھی کیا اس میں جدت پیدا کردیا۔ اسی وجہ سے اسے بالی ووڈ میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اس کی زندگی دشوار تو تھی لیکن اس نے کبھی تھک کر بیٹھنا نہیں سیکھا تھا۔ اس وقت بھی وہ کسی اہم کام کو کرنے پر غور کررہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی جس نے اسے چونکا دیا۔ اسے یاد آیا کہ آج اس کا پیون چھٹی کرگیا ہے۔ اسے خود ہی دروازہ کھولنا ہوگا۔ اس

باوقار نغمہ نگار

انور فرہاد

پاکستانی فلمی صنعت نے نہایت کم وقت میں عروج حاصل کیا اور پھر اسے زبردستی زوال سے ہمکنار کرایا گیا۔ اسے عروج دینے میں بہت سے ہنرمندوں کی محنت رہی ہے۔ انہی میں سے دو معروف شاعر کا مختصر مختصر تذکرہ جن کے اشعار کا بدل نہیں، جنہوں نے اردو ادب کو بھی خزانہ عطا کیا۔

فلمی معلومات سے دلچسپی رکھنے والوں کی پذیرائی

برصغیر میں گانوں اور گیتوں کو فلموں کی جان سمجھا جاتا ہے۔ جس فلم میں کوئی گانا نہ ہوا سے دستاویزی اور ڈاکومنٹری کی کیٹیگری میں شمار کیا جاتا ہے۔ گویا فیچر فلموں کے لیے گیتوں کو ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ فلموں کے جو بنیادی چار ستون ہیں ان میں موسیقی ایک ستون ہے جب کہ دیگر کہانی، ہدایت کاری اور اداکاری ہیں۔

موسیقی کی ترتیب و تزئین میں تین ہنرمندوں کی صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ موسیقار، نغمہ نگار اور گلوکار۔ جس طرح فلم کے لیے کہانی کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اس طرح موسیقی کے لیے نغمہ نگار کی کاوش

ساحرِ کرکٹ

امیر حسین چمن

کرکٹ ایک کھیل نہیں جنون ہے۔ اسے پاکستان میں مقبول بنانے کے لیے جن کھلاڑیوں نے محنت کی انہی میں سے ایک وہ بھی تھا۔ اس کا کھیل جادوئی ہوتا۔ مقابل کا ٹھہر جانا بھی ناقابل یقین تصور کیا جاتا تھا۔ وہ خوب صورت بھی اتنا تھا کہ اسے یونانی دیوتا کہا جاتا۔ انگلینڈ کے بچوں سے سوال ہوتا کہ پاکستان کہاں واقع ہے تو وہ جواب میں کہتے جہاں فضل محمود رہتا ہے۔

ایک معروف کھلاڑی کی زندگی کے اوراق

انگلستان کے ایک جونیئر ماڈل اسکول کا واقعہ ہے، پانچویں جماعت میں جغرافیہ کا پیریڈ تھا۔ استاد ابھی کلاس روم میں نہیں پہنچا تھا۔ بچوں نے شور مچا کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ جونہی استاد کمرے میں داخل ہوا تمام بچے خاموش ہوگئے لیکن چند لمحوں کے بعد پھر بچوں نے آپس میں باتیں کرنی شروع کر دیں، استاد سمجھ گیا کہ آج بچوں کے پڑھنے یا لکھنے کا موڈ نہیں ہے۔ اس نے بلند آواز میں ''خاموش'' کرتے ہوئے کہا۔ ''بچو! آج میں تمھیں
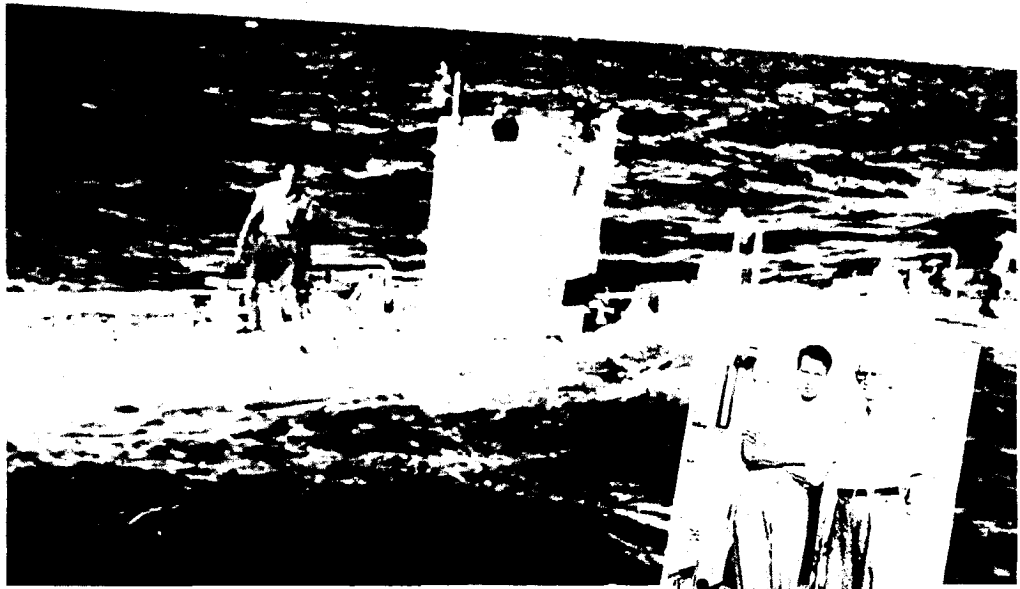
غوطہ خور

طارق عزیز خان

زیرِ آب دنیا بھی بہت خوب صورت، گہما گہمی سے بھری اور مخلوقات کی لاکھوں اقسام سے سجی ہے۔ جتنی آبادی کرئہ ارض پر ہے، جتنے اقسام کے جاندار زمین کے اوپر ہیں ان سے کئی گنا زیادہ اقسام کے جاندار سمندر کے نیچے ہیں، ان پر تحقیق کرنے والوں میں چند نام سرفہرست ہیں۔

معلومات کے شائقین کی مدارات

کرۂ ارض پر کہیں پہاڑ ہیں تو کہیں سرسبز لہلہاتے کھیت کھلیان، کہیں بے آب و گیاہ صحرا ہیں تو کہیں چنگھاڑتے ہوئے دریا۔ تاہم یہ سب کچھ زمین کے اس حصے پر واقع ہے جسے ہم خشکی کہتے ہیں۔ زمین کا تین چوتھائی حصہ سمندروں پر مشتمل ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جہاں ابھی بہت کچھ دریافت ہونے کو ہے۔ کہتے ہیں کہ زمین پر

ملّی نغمے

عبدالوحید مزاج

ملّی نغمے حب الوطنی کے جذبے کو سوا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ زمانہ قدیم سے قوم کو جگانے کے لیے رزمیہ گیت کہے جارہے ہیں لیکن پاکستان میں جو نغمے کہے گئے وہ ادبی لحاظ سے بھی اپنا الگ مقام رکھتے ہیں۔

ملّی نغموں پر ایک مختصر سا جائزہ

قومی زندگی میں ملی نغموں کی ہمیشہ سے ہی اہمیت رہی ہے۔ پرانے زمانے میں جنگوں کے دوران قومی گیت گا کر سپاہی وطن کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ اجاگر کرتے جبکہ محاذ جنگ میں روانگی سے قبل خواتین اپنے مردوں کے سامنے رزمیہ گیت گا کر انہیں بہادری و شجاعت کے ساتھ لڑنے پر آمادہ کرتیں۔ چونکہ ملی نغمے وطن سے محبت کے اظہار کا خوبصورت انداز ہیں اس لیے ملی نغمہ سنتے ہی وطن سے محبت کا جذبہ اور جوش و خروش سوا ہو جاتا ہے۔

جنگ کا زمانہ ہو یا آزادی کی سالگرہ یا پھر کوئی بھی

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے

عقیدت

محترم مدیر

سلامِ تہنیت!

اس بار میں نے ایک چونکا دینے والے واقعہ کو قلم بند کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہو لیکن میں نے کوشش کی ہے کہ وہ تمام باتیں اس سچ بیانی میں آجائیں۔ انسان مجبور ہے، اپنی مرضی سے جینے کا دعویٰ بھی کرتا ہے لیکن سب جھوٹ ہے۔ انسان اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جسم پر بیٹھنے والی مکھی کو بھی اڑا نہیں سکتا۔ حالات اسے اپنی مرضی سے چلاتے ہیں۔

کنیز زہرا

(لاہور)

وہ خبر جو پہلے سوشل میڈیا پر آئی پھر وہی خبر مین اسٹریم میڈیا پر آئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وائرل ہوگئی۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ایک انسان اپنے ہی ہاتھ کو خود بطور کفارہ کاٹ لے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ پہلے اخبارات میں مراسلے چلے پھر ٹی وی چینلوں پر مذاکرے اور عین اس دن جس دن اجو شہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ آٹھ دس کاروں کا قافلہ گاؤں میں داخل ہوا۔ اس کارواں میں ملک کی جانی مانی ہستی، سیاست میں اپنا مقام بنا رہے ایک بڑے عالم دین بھی شامل تھے۔ عقیدت مندوں نے گاؤں میں داخل ہوتے ہی نعرۂ توحید و رسالت سے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ چودھری صاحب خود بھی ان کے عقیدت مند تھے۔ وہ بھاگتے ہوئے حویلی سے نکلے اور ان کی کار کے آگے گویا بچھ گئے۔ زبردستی انہیں حویلی میں لائے۔ مولانا نے بیٹھتے ہی کہا۔ ”اوے چودھری تیرے پنڈ وچ اجو رہندا؟“

”جی جی بلاؤں اسے؟“ اتنا کہتے ہی اس نے بندے دوڑا دیے۔

☆......☆

اس سیاسی عالم دین کے پنڈ میں آنے سے قبل کی بات ہے۔ چودھری صاحب نے وعظ کی محفل کا اعلان کرایا تھا۔ جمعرات کی رات محفل منعقد ہوئی تھی۔ شہر سے کئی خوش الحان نعت خواں اور خوش بیان واعظ آئے ہوئے تھے۔ کئی نعت خوانوں کے بعد فخرِ ملک و ملت، شعلہ بیان مقرر مولانا الحاج شفیع مائیک پر آئے تھے کہ اجو سے غلطی ہوگئی۔

محفل اپنے عروج پہ تھی۔ معروف نعت خواں میٹھے لب و لہجے میں عقیدت کے موتی پروئے اپنی خوش الحان آواز میں نعتیہ کلام پیش کر رہے تھے۔ گاؤں کی مسجد کے مولوی صاحب تقریب کی میزبانی کرتے مائیک ہاتھ میں لیے نعرے لگوا رہے تھے۔ نعت خواں جذب کے عالم میں کلام پیش کر رہا تھا۔

ہر خطا پر شرمسار ہوں میں
اے خدایا گناہ گار ہوں میں

وہیں قیمتی نقشین کرسیوں اور صوفوں پر گاؤں کے معززین جم کے بیٹھے تھے۔ جن میں سے کچھ اپنی نشستوں سے اٹھ کے اب نوٹوں کی گڈی ہاتھوں میں لیے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے نعت خواں پہ وار رہے تھے۔ اس ساری تقریب کی وڈیو بناتا ماہر کیمرا مین ان نوٹ وارتے امراء کی ہر اینگل سے عکس بندی کرنے میں مگن تھا۔ ہر نعت خواں کے ساتھ آئے ہوئے لوگ اس فکر میں تھے کہ کہیں وارے گئے نوٹ گاؤں کے غریب بچوں کے ہاتھ نہ لگ جائیں۔ بچوں کے بڑے، کیڑے

نیا جال

محترمہ عذرا رسول
سلام تہنیت!
یہ شہر کراچی ایک بھول بھلیاں ہے، ایسا گورکھ دھندا جس کا سرا پا لینا مشکل ہے۔ یہاں ایسے ایسے شکاری جال پھیلائے بیٹھے ہیں کہ ان کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ ایک ایسے ہی جال کے بارے میں بتانا چاہتی ہوں جو پڑھنے والے کو دم بخود کردے گا۔

ڈولی
(کراچی)

شکار سامنے والے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔
میرا کام بہت آسان بھی تھا اور مشکل بھی۔ آسان اس لحاظ سے کہ مجھے اس کے پاس جا کر میٹھی میٹھی باتیں کرنی تھیں اور مشکل اس لیے کہ کبھی کبھی مجھے کسی پر ترس بھی آجایا کرتا۔ میں نادر سے کہتی۔ "وہ سیدھا بندہ معلوم ہوتا ہے باس۔ میرا خیال ہے کہ اس کا پراپر علاج کروایا جائے۔"
نادر اس وقت مجھے سمجھاتا۔ "دیکھو ڈولی جو کچھ ہم

خط

جناب ایڈیٹر
السلام علیکم!
میں اپنی زندگی سے اخذ کر کے ایک دلچسپ واقعہ سنانا چاہ رہا ہوں۔ کوشش کی ہے کہ قارئین اختتام تک دلچسپی لیں اس لیے مزاح کے رنگ میں واقعات کو پرویا ہے۔ امید ہے پڑھنے والوں کو میرا یہ انداز پسند آئے گا۔
مانی
(کراچی)

خط لکھنا بھی ایک آرٹ ہے اور خط بھی ایسا جو فوراً اثر کرے اور جس کا جواب ہاں میں ملے۔

میرا دعویٰ تھا کہ میرے لکھے ہوئے خط ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس کی تصدیق اس طرح ہوتی ہے کہ ایک بار میرے ایک دوست کو کسی سے قرض لینے کی ضرورت پیش آ گئی۔ وہ مسمسی سی صورت بنا کر میرے پاس آ گیا۔ ''مانی بھائی! مجھے ریاست صاحب سے قرض لینا ہے۔'' اس نے کہا۔

آزاد فضا

جناب، مدیراعلیٰ
السلام علیکم!
انسان کی شخصیت پرت در پرت ہوتی ہے۔ یاسمین کی مثال لے لیں، اس کی زندگی میں اتنے موڑ آئے کہ وہ خود بھی حیران رہ گئی، اس پر جو بیتی ہے اسے ہی میں نے الفاظ کو آئینہ بنا کر قرطاس پر سجایا ہے۔ میں ٹھہرا افسانہ نویس اس لیے افسانے کی تیکنیک سے اس کہانی کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

مسعود الرحمن
(حیدرآباد)

یاسمین نے بے دلی سے اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور لباس تبدیل کیے بغیر ہی بستر پر گر پڑی۔

ایک اور تھکا دینے والا دن ختم ہوا۔

صبح سویرے گھر سے نکلنا، بڑی سڑک کے فوارے والے چوک کے پاس درختوں کے کنارے کھڑے ہو کر یونیورسٹی کی بس کا انتظار کرنا اور پھر چلتی ہوئی بس کی کھڑکی سے مخلوقِ خدا کو حصولِ رزق یا کسی اور سبب سے بھاگتے ہوئے دیکھنا اس کا روز کا معمول تھا۔

کچھ تو کہیے

محترم ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
ایک چھوٹا سا واقعہ بھیج رہا ہوں جو خود میرا ہے۔ اس سچ بیانی میں تھوڑا سا مبالغہ بھی شامل کیا ہے تاکہ دلچسپی قائم رہے۔ انسانی نفسیات کی یہ گتھی سلجھنا آسان نہیں ہے۔

ظفر حامد
(کوئٹہ)
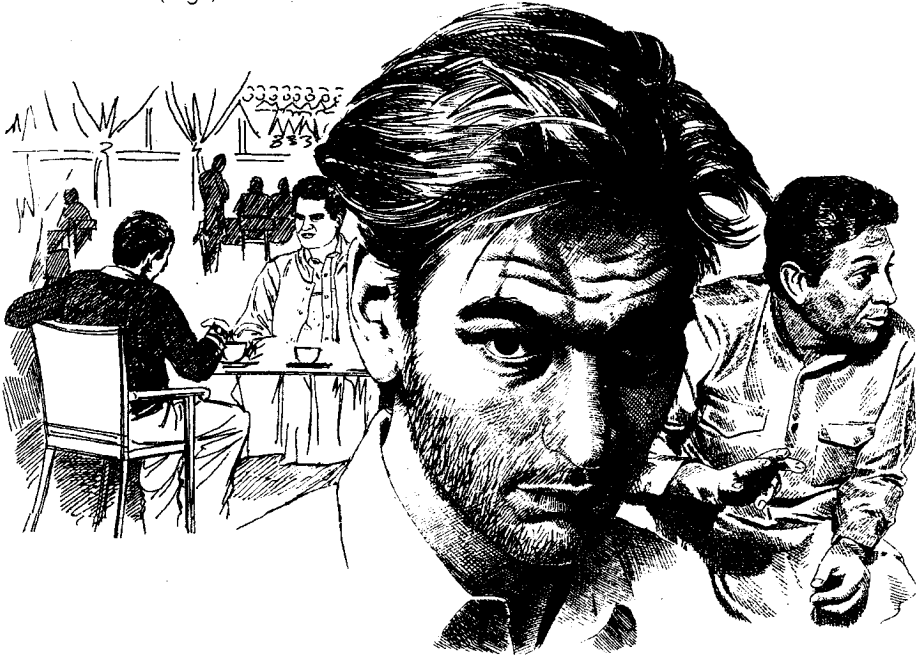
میں اسے جانتا بھی نہیں تھا لیکن اس نے میری جان کھالی تھی۔

میں ایک ہوٹل میں بیٹھا تھا۔ میرے دوست ابھی تک نہیں آئے تھے۔ ہم اس ہوٹل میں روزانہ ہی بیٹھا کرتے تھے۔ ہم خیال لوگوں کا ایک گروپ بن گیا تھا۔ ہمارے درمیان دنیا بھر کی باتیں ہوا

جانے والے

محترم و مکرم مدیر
سلام مسنون!
میں نہ تو قلم کار ہوں اور نہ کبھی کوئی کہانی یا افسانہ لکھا۔ ہاں افسانہ پڑھنے کا شوق بہت ہے۔ سرگزشت میرا پسندیدہ ڈائجسٹ ہے۔ دوسروں کی کہانیاں پڑھتے پڑھتے سوچا کہ اپنی کہانی بھی لکھ دوں۔ اس لڑکی نے کس طرح مجھے حیران کیا ہے آپ بھی ملاحظہ کریں۔

فرخ شیراز
(لاہور)

میرے پاس ایک ہینڈ بیگ تھا جس میں ضرورت کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔
میں نے اپنے ساتھ کپڑے نہیں رکھے تھے کیوں کہ بہت سے گرم کپڑے میں نے اس وقت پہن رکھے تھے۔ ہاتھوں میں دستانے بھی تھے اور سر پر ایک موٹی اونی ٹوپی تھی جو مجھے برفیلی ہواؤں کے تھپیڑوں سے بچا رہی تھی۔

میں نے سنا تھا اور اس کا تجربہ بھی تھا کہ اگر سر اور کانوں کو اچھی طرح گرم کپڑے سے ڈھانپ لو تو سردی کا احساس کم ہو جاتا ہے۔ میں مری جا رہا تھا۔ پنڈی کے علاقے فیض آباد سے میں نے ایک بڑی وین پکڑی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ مری میں اس وقت برف باری ہو رہی ہے۔ ایک تو برف باری انجوائے کرنی تھی پھر کسی سے

مجرم

محترم مدیراعلیٰ

السلام علیکم!

میں نے پہلی بار کہانی لکھی ہے اور یہ کہانی خود میری اپنی ہے۔ مجھ پر جو گزری ہے وہی کچھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ کاش میں نے بچوں پر سختی نہ کی ہوتی۔ آخر میں ایک التجا ہے کہ میرا اصل نام کہانی پر نہ دیں جو نام لکھا ہے وہی چھاپیں۔

نویدالحسن

(کراچی)

اس روز پھر وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ بات بہت معمولی تھی اور باپ ہونے کے ناطے مجھے اتنا حق تھا کہ میں اسے سرزنش کر سکوں لیکن اس کی سرکشی اور گستاخی دن بہ دن بڑھتی جارہی تھی اور اسے معمولی روک ٹوک بھی گوارا نہیں تھی حالانکہ میں نے صرف اتنا کہا کہ مغرب سے پہلے گھر آجایا کرو۔ یہ سنتے ہی اس کا چہرہ لال ہوگیا۔ وہ کھانا کھانے بیٹھا تھا اور اس کی ماں لاڈلے بیٹے کے لیے گرم گرم روٹیاں ڈال رہی تھی جیسے

ڈیئر ایڈیٹر

سلام شوق!

ایک سچ بیانی ارسال کررہا ہوں۔ یہ سرگزشت ہے ملیحہ کی، اسی لیے اس کے واقعات اسی کی زبانی سنا رہا ہوں تاکہ پڑھنے والے کو مزہ آئے لیکن اس سچ بیانی کو صرف وقت گزارنے کے لیے نہ پڑھیں، سبق حاصل کریں کہ آج کل ہمارے ارد گرد کیسے کیسے لوگ رہ رہے ہیں۔

ارشد ابرار ارش

(اسلام آباد)

آج بھی معمول کے مطابق میری آنکھ امی کی آواز سے ہی کھلی۔ حالانکہ رات عزم مصمم کرکے سوئی تھی کہ صبح تڑکے امی سے پہلے اٹھ کے نماز ادا کرنی ہے۔۔ورنہ امی کے پیار بھرے طعنے پھر سے سننے کو ملیں گے لیکن اللہ جانے کیوں میری نیند شروع سے ہی کچھ ایسی تھی کہ ایک بار اگر آنکھ لگ گئی تو دنیا بھر کے ڈھول، نقارے، ڈھگل سب کچھ پیٹتے رہو میں نے اٹھنا پھر اپنی مرضی سے ہوتا ہے۔ امی کو میری اس عادت سے چڑ رہی ہے۔ ان کا

محترمہ عذرا رسول

السلام علیکم!

اس سے قبل بھی میری تحریر کردہ کئی سچ بیانیاں سرگزشت کی زینت بن چکی ہیں۔ آج ایک اور سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ حسن آراء کی سرگزشت ہے اس بے چاری نے کس طرح زندگی کو "بھگتا" ہے یہی کچھ میں نے بتانا چاہا ہے۔

فرح انیس

(کراچی)

میرا پسندیدہ شوق کہانی کی تلاش ہے اور کہانیاں انسانوں کی بھیڑ میں ملتی ہیں۔ ہمارے آس پاس کھلتے ہوئے، مرجھائے اور بسورتے ہوئے لاتعداد لوگ نظر آجاتے ہیں جن کے سینوں میں کہانیاں ہوتی ہیں، بس انہیں کریدنے کی دیر ہے۔ حسن آراء بھی ایک ایسا ہی کردار ہے جس نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ آج ہم اس کی کہانی سنانا چاہتے ہیں پوری کہانی اسی کی زبانی سنیں۔

کراسنگ پوائنٹ

محترم مدیر
السلام علیکم!
ان دنوں کشمیر خبروں میں ہے۔ ایسے وقت میں عرصہ پہلے جب میں پیشہ وارانہ ذمے داریاں نبھانے آزاد کشمیر میں تھا وہاں مجھے ایک محترمہ نے ایک واقعہ سنایا تھا۔ وہ واقعہ میرے ذہن میں چبھ کر رہ گیا تھا اسے میں نے افسانوی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

عتیق الرحمن
(دبئی، یو اے ای)

چھلانہ چیک پوسٹ پر معمول کی چیکنگ کے لیے رکنے کے بعد ہماری بس اب ٹیٹوال سیکٹر پر اس مقام کی طرف رواں دواں تھی جہاں نیلم روڈ دریا پار دائیں طرف پھیلی ہوئی انڈین ہیلڈ کشمیر کی پہاڑیوں سے گلے ملتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ہمارے بائیں طرف ''آزاد'' پہاڑ تھے جن کے پیٹ کے نچلے حصّے میں نیلم روڈ بڑی آنت کی طرح بچھی ہوئی تھی۔ سڑک کے دائیں کنارے پر چھوٹے چھوٹے پتھروں کی